حدیث کے دو رُخ اور قرآن

(جناب مولانا تمنا عمادی مجیبی)

پہلا رُخ

قرآن پاک کا نزول جُمْلَةً وَّاحِدَةً نہیں ہُوا یعنی ایک بار پورا قرآن رسول اللہ صلعم پر نہیں اُتار دیا گیا کہ آپ پورا قرآن امت کے سامنے پیش کر دیتے۔ کیوں ؟ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ[1] تاکہ قرآن کو پوری طرح تمھارے دل نشین کر دیں[2]۔

رسول اللہ صلعم کی سب سے بڑی خدمت جو آپ کو من جانب اللہ تفویض کی گئی تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفوس تھی پچھلی دونوں خدمتوں کا ماخذ بھی کتاب اللہ ہی تھا اور ہے، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اصل الاصول وہی "تعلیم کتاب" ہی تھی۔ ظاہر ہے جب تک قرآن پوری طرح خود آپ کے[3] "دل نشین" نہ ہو، اُس وقت تک آپ قرآن کو دوسروں کے دل نشین نہیں کرا سکتے تھے اور جب تک خود آپ کو قرآن کا صحیح علم نہ ہو۔ دوسروں کو قرآن کی صحیح تعلیم نہیں فرما سکتے تھے، اسی لیے جہاں اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا[3] فرمایا گیا، وہاں اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ بھی فرمایا گیا اور پھر وَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ[4] بھی ارشاد ہُوا یعنی، رسول صلعم پر قرآن نازل فرمایا گیا، تو قرآن کا علم[5] بھی رسول صلعم کو عطا ہُوا اور قرآن ہی کے ذریعے لوگوں کو نصیحت کا بھی حکم دیا گیا

تعلیم و تبلیغ کا فرق "تعلیم" و "تبلیغ" لفظاً، معنیً، لغۃً اور محاورۃً ہر حیثیت سے دو چیزیں ہیں۔ "تبلیغ" کے معنی ہیں، فقط پہنچا دینا[6]۔ ڈاکیے کا فرض صرف اسی قدر ہے کہ وہ بھیجنے والے کا خط مکتوب الیہ تک پہنچا دے۔

---

[1] سورہ فرقان۔ [2] لنثبتہ فی فوادک نہیں ہے (مدیر) [3] سورۂ دہر [4] سورۂ قٓ [5] یعنی قرآن اور قرآن کا علم دو الگ الگ چیزیں ہیں اور وہ بھی بہ لحاظِ نزول، یعنی چہ؟ کیا وہ علم قرآن کے اندر نہیں؟ "انما انزلنٰہ بعلم اللہ" وغیرہ [6] نہیں حضرت! اس کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ اگر یہی ہے تو وما علینا الا البلاغ المبین کا کیا مطلب ہے؟ فانما علیک البلاغ کو کیا سمجھیں؟ علمائے لغت کے نزدیک بلاغ و تبلیغ ایک ہی چیز ہے: کما فی لسان العرب و مفردات راغب وغیرہ: اس کا مطلب ہے: الانتھاء الی اقصی المقصد والمنتھی الخ۔ خود قرآن مجید میں ہے قل لھم فی انفسھم قولاً بلیغاً ○ اور فللّٰہ الحجۃ البالغۃ، حکمۃ بالغۃ فما تغنی النذر، یہاں النفس، حجت اور حکمۃ سے بلیغ و بالغہ کی تخصیص کیا معنی رکھتی ہے؟ یہ بھی یاد رہے کہ تمام لغت نویسوں نے "بلاغ" کے معنی "کفایت" بھی لکھے ہیں۔ (مدیر)

مجھ سے وہ خط پڑھا جائے گا یا نہیں، میری سمجھ میں آئے گا یا نہیں، مجھے اُس خط کے مضامین سے اتفاق ہوگا یا اختلاف، ان میں سے کسی بات سے بھی ڈاکیے کا کوئی تعلق نہیں، نہ وہ ان میں سے کسی بات کا ذمہ دار ہے، کیوں کہ اس کے ذمہ صرف تبلیغ ہے۔

مگر اللہ تعالیٰ کے ایک رسول کا صرف یہی کام نہیں کہ وہ اس کے بندوں تک محض اس کی کتاب پہنچا دے اور بس۔ بندے سمجھیں یا نہ سمجھیں، غلط سمجھیں یا صحیح سمجھیں ان باتوں سے اس رسول کا کوئی سروکار نہ ہو، ایسا ہرگز نہیں، بلکہ تبلیغ کے ساتھ ساتھ آیات کتاب کے صحیح معنی و مفہوم کی تعلیم بھی اس رسول کا فرض ہے اور فقط تعلیم ہی نہیں، بلکہ اس تعلیم کے مطابق خود عمل کرکے دکھا دینا اور اپنی نگاہوں کے سامنے پوری نگہداشت کے ساتھ مبعوث الیہم یعنی اپنی اُمت سے عمل کرا دینا، اس حد تک کہ پھر وہ صحیح تعلیم کو بھول نہ پائیں، یہ بھی اُسی رسول کا فریضہ ہے

کفایتِ قرآن | بے شک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے اور بہت صحیح ارشاد ہے۔ اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ[۵۰] الآیہ یعنی۔ یہ کتاب (قرآن) جو اُن کے سامنے تلاوت کی جاتی ہے، ہم نے اس کو اے رسول تجھ پر جو نازل کردی ہے، کیا یہ اُن کے لیے کافی نہیں ہے؟ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کتاب انسان کی تمام دینی و دنیوی ضروریات سے متعلق ساری ہدایات اپنی آغوشِ تعلیم میں رکھتی ہے اور اسی اعتبار سے فرمایا گیا ہے۔ وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ[۵۱] یعنی، اس کتاب کو ہم نے ہر بات کے بیان کر دینے کے لیے (اے رسول!) تجھ پر اتارا اور ارشاد ہوا: مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ[۵۲] یعنی اس کتاب میں ہم نے کوئی کمی نہیں چھوڑی، اس لیے بے شک یہ کتاب مبین اپنے مفہوم کے ادا کرنے میں، اپنے ارشادات کے بیان کر دینے میں ان ہدایات کی احاطت و تکمیل میں ہرگز ہرگز کسی بیرونی اضافے کی محتاج تو کیا متحمل تک نہیں۔

لیکن انسانوں کے طبائع و رجحانات کا تنوع، ان کے فہم و عقل کے مدارج کا اختلاف اور پھر نفسانی خواہشوں اور ذاتی غرضوں کی کشاکش سے کیا یہ امید ایک لمحہ کے لیے بھی کی جا سکتی ہے کہ اگر یہی کتاب مبین جُمْلَةً وَّاحِدَةً پوری کی پوری صرف ان کو دے دی جاتی اور معلم کتاب ان کو اس کتاب مبین کے ساتھ نہ ملتا، تو سارے مہاجرین و انصار ہر آیت کا ایک ہی مفہوم سمجھتے اور ہر حکم کو ایک ہی طرح

---

۵۰ عنکبوت　۵۱ نحل　۵۲ انعام

بجالاتے؟ اور ان میں کسی طرح کا اختلاف نہ ہوتا؟ وہ اختلافات جو دو ڈھائی سو برس بعد سے شروع ہوئے، ان سے کہیں زیادہ اُسی وقت خود مہاجرین و انصار میں پیدا ہو جاتے اور ہر شخص کا مذہب اس کی سمجھ، ہر شخص کا دین اس کی عقل ہو کر رہ جاتی اور ایسی طوائف الادیانی اسلام میں خود عہد نبوی میں پیدا ہو جاتی کہ رسول ﷺ کا مذہب کچھ ہوتا، ابوبکرؓ کا مذہب کچھ، عمرؓ کا دین کچھ، عثمانؓ کا دین کچھ، علیؓ کا اسلام کچھ ہوتا اور عباسؓ کا اسلام کچھ۔[1]

اس لیے اس کا فرق سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قرآن مبین اپنے بیان مفہوم میں کسی کمی یا نقص یا اجمال کی وجہ سے (نعوذ باللہ) کسی کی توضیح و تشریح و تفصیل کا محتاج نہیں، بلکہ انسان اپنے تنوع طبائع اور اختلاف مدارج عقل اور انتشار رجحانات کی وجہ سے اور پھر اپنے جہل اور اپنی کم علمی کی وجہ سے قرآن پاک کے صحیح معانی و مطالب کے سمجھنے میں ایک من جانب اللہ معلم کے محتاج تھے اور ہیں، تاکہ قرآن مبین کو سمجھیں، تو اُسی من جانب اللہ معلم کی تعلیم و تبیین کے مطابق اور اپنے آپس کے سارے اختلافات کا فیصلہ اُسی معلم و مبین کی تعلیم و تبیین کے مطابق قرآن مبین سے کر لیا کریں۔ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ[2] لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝[3] یعنی (اے رسول!) اس قرآن کو ہم نے تمہاری طرف اس لیے اتارا کہ تم اُس چیز کو جو لوگوں کی طرف اتاری گئی ہے، اُن کے لیے واضح کر دو (بیّن الشیٔ اوضحہ) اور تاکہ وہ (خود بھی) غور و فکر سے کام لیں اور فرمایا گیا وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝[4] یعنی ہم نے اس کتاب کو تو اسی لیے اتارا ہے کہ جو لوگ باہم اختلاف رکھتے ہیں، اس مختلف فیہ بات کا تم (اے رسول! اس کتاب کی رو سے) واضح فیصلہ

---

[1] بے شک معلم کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کتاب کی، لیکن اس کو یہاں تک نہ کھینچیے کہ کتاب بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے اور متکلم جل ذکرہٗ اتنا قاصر البیان ثابت ہو کہ معاذ اللہ ——— آخر انسانی کتابیں بھی تو بغیر معلموں کے شائع و ذائع ہوتی ہی ہیں اور ان کے مفاہیم بھی عموماً متعین ہی ہوتے ہیں۔ طب، صرف و نحو، جغرافیہ، ہیئت وغیرہ کو دیکھیے۔ کیا ہر ہر شخص ان کو الگ سمجھتا ہے؟ وہاں بھی تو انتشار رجحانات کا عذر موجود ہے، پھر متکلم قرآن جل ثناءہٗ کی قوت بیانیہ کے متعلق یہ بدگمانی کیوں؟ (مدیر)

[2] لتبیّن کی خصوصیت بھی خود ساختہ ہے۔ کما قال فی اہل الکتاب، لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ۔ اور قرآن خود بیان ہے "ھٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ" یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیان کو اپنے ذمے لیا ہے "علینا بیانہ"۔ آپ کی پیش کردہ آیات میں پہلی آیت میں لتبیّن سے پہلے الذکر اور دوسری میں الکتٰب ہے یعنی، ذکر یا کتاب کی مدد سے تعیین کرو، اُن اختلافات سے متعلق جو نزول کتاب سے پہلے اہل کتاب وغیرہ میں رائج ہو چکے تھے (مدیر)

[3] نحل [4] منجد [5] نحل

کردو اور ہم نے اس کتاب کو ایمان دار قوم کے لیے ہدایت و رحمت بنا کر اُتارا۔

غرض یہ کہ انسانوں کو جس طرح ہر دینی و دُنیوی ہدایت کے لیے کتاب اللہ یعنی اس قرآنِ مبین کی ضرورت تھی اور ہے، اسی طرح اس کتاب کے ایک منجانب اللہ مُعلّم و مُبیّن کی بھی ضرورت تھی اور ہے۔ جس طرح کوئی ہدایت خواہ انسان قرآنِ مبین سے مستغنی نہیں ہو سکتا، بالکل اسی طرح وہ رسول اللہ صلعم کی تعلیم کتاب و تبیینِ قرآن سے بھی مستغنی نہیں ہو سکتا[1]۔ جس نے "الاکتفا بالقرآن" کے یہ معنی سمجھ رکھے ہیں کہ وہ تعلیم و تبیینِ رسول سے مستغنی ہو کر اپنی عقل اور اپنی سمجھ سے جو کچھ مفہوم قرآن بطورِ خود سمجھ لے۔ اسی پر اکتفا کرے، تو وہ ہرگز ہرگز قرآن مبین پر اکتفا نہیں کر رہا ہے، بلکہ اپنی عقلِ ناقص اور فہمِ قاصر پر اکتفا کر رہا ہے۔ وَشَتَّانَ بَیْنَھُمَا۔

تعلیم و تبیینِ رسول صلعم | باقی رہا یہ سوال کہ تعلیم و تبیینِ رسول صلعم کیا تھی اور کس طرح تھی اور وہ اُمت کو کس طرح ملی اور آج ہمیں کس طرح مل سکتی ہے؟ یہی سب سے بڑا اہم سوال ہے اور آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔

مگر قبل اس کے کہ اس سوال کا جواب دُوں، مجھ کو اُن بزرگوں پر اظہارِ تعجب کرنے دیجیے: جو قرآن پاک کو رسول صلعم کی تعلیم و تبیین سے تو مستغنی قرار دیتے ہوئے اس کی مطلقاً ضرورت نہیں سمجھتے[2] کہ کبھی اس پر بھی غور کریں کہ آخر رسول صلعم اس آیت کے کیا معنی سمجھتے تھے اور صحابہ رضؓ کو آپ نے کیا سمجھایا تھا؟ خود اپنی تعلیم و تبیین کی اشاعت اور اس کو دوسروں سے منوانے کے لیے ایڑی سے لے کر چوٹی تک زور لگاتے رہتے ہیں۔

مثلاً اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ[3] کا حکم قرآن پاک میں آیا ہے۔ تو ان کے نزدیک یہ دریافت کرنا کہ رسول صلعم خود "اقامتِ صلوٰۃ" کے کیا معنی سمجھتے تھے؟ صحابہ رضؓ کو کیا سمجھایا تھا؟ خود کیوں کر اس حکم کی تعمیل کی تھی؟ دوسروں کو اس حکم کی تعمیل کا کیا طریقہ بتایا تھا؟ ان باتوں کی جستجو اور دریافت تو قطعاً حرام اور ناجائز، مگر یہ جو "اقامت" اور "صلوٰۃ" کی تشریح کریں۔ یہ جو معانی بیان کریں، وہ سب واجب الایمان اور جو ان کے

---

[1] بقولِ جناب "قرآنِ مبین" اور آں حضرت کی تعلیم و تبیین کتاب اس لحاظ سے یکساں ہیں کہ کوئی ہدایت خواہ انسان ان دونوں سے مستغنی نہیں ہو سکتا ہے۔ کیا آں حضرت صلعم نے آپ کی طرح اس ضرورت کا احساس فرمایا تھا اور اُمت کو یکساں حفاظت کے ساتھ یہ دونوں چیزیں پہنچا دی تھیں؟ لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ اور دوسری ایسی ہی احادیث کو بھی سامنے رکھیں (مدیر)۔ [2] ہم تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر اُس چیز سے مستفید ہونا اپنی سعادت سمجھتے ہیں، جو فہم قرآن میں ممد ہو، وہ حدیث ہو یا تفسیر، لغت ہو یا شعر عرب وغیرہ (مدیر)۔ [3] کیا اقامتِ صلوٰۃ زمانہ نزولِ قرآن کی ایجاد ہے یا انبیائے سابقین بھی اس راز سے واقف تھے؟ قرآن سے جواب دیں! (مدیر)

بیان کردہ تصریحات کو نہ مانے، وہ گم راہ!

اگر کوئی رسول اللہ صلعم کی ارشاد فرمودہ تعلیم وتبیین کتاب کی روایت کرے، وہ سرے سے ناقابلِ اعتبار اور کذب و افترا، مگر جو شخص مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم ومغفور اور مولانا احمدالدین مرحوم ومغفور[۱] وغیرہما کی تشریحات وتوضیحات کی نقل یا روایت کرے تو وہ بالکل صحیح اور قابلِ اعتبار:

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

بہرحال، ہم اس اہم سوال کا جواب دیتے ہوئے نہایت صفائی اور پوری طمانیتِ قلب وجرأتِ ایمانی کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ رسول اللہ صلعم کی تعلیم وتبیین کتاب کا ایک معقول اور غیر مشتبہ اور قطعی ویقینی حصہ تو ہمیں قرآن پاک ہی میں مل جاتا ہے اور باقی حصہ ہمیں روایات ہی کے ذریعہ ملتا ہے، اس لیے ہم روایات سے بالکل مستغنی نہیں ہوسکتے[۲]۔ واللہ اعلم:

چارہ نہیں ہرچند روایت کے بغیر ۔۔۔ مانو نہ روایت کو درایت کے بغیر
تقلید ہے رات اور تحقیق ہے شمع ۔۔۔ شب کو نہ چلو شمع ہدایت کے بغیر

روایت ظنی ہے یا قطعی | کہا جاتا ہے کہ ہر روایت ظنی ہے اور قرآن پاک کا فیصلہ ہے کہ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا، یعنی حق ویقین کے مقابل ظن وگمان کچھ کام نہیں دے سکتا، اس لیے ان روایات کا کوئی اعتبار نہیں۔

اس قول میں دعویٰ اور دلیل دونوں محلِ نظر ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ "ہر روایت ظنی ہے" اس دعوے کے متعلق غور کرنا ہے کہ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ ایسا نہیں ہے، کیوں کہ جب رسول صلعم کو تعلیم وتبیینِ قرآن کا حکم تھا، تو آپ نے یقیناً تعلیم وتبیین فرمائی اور قرآن پاک کے بعض مضامین کی تشریح اپنے الفاظ میں ضرور فرمائی اور تمام احکام کی تعمیل بھی ضرور کی۔ صحابہ رض کو تعمیلِ احکام کے طریقے ضرور بتائے۔ صحابہ رض کا تعامل احکامِ قرآنیہ کے متعلق عہد نبوی میں ضرور رہا۔ یہ سارے واقعات یقیناً قطعی اور یقینی ہیں، جن میں بعض کی

---

[۱] کون نادان ان مولانا کی تشریحِ قرآن کو قرآن کے ساتھ مثلہٗ معہٗ بالکل صحیح "سمجھتا ہے؟ (مدیر)

[۲] محترماً ہم قرآن سمجھنے کے لیے کسی علم سے بھی مستغنی نہیں ہوسکتے۔ وہ تاریخ ہو یا جغرافیہ، ہیئت ہو یا طبقات الارض لیکن قرآن کے سوا کوئی اور علم وحی معصوم کا مرتبہ نہیں رکھتا۔ (مدیر)

تفصیلی اور سب کی اجمالی شہادت قرآنِ پاک خود دے رہا ہے۔

اب اُن واقعاتِ قطعیہ کا علم بعد والوں کو یقیناً عہدِ نبوی کے لوگوں سے یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم سے سُن کر ہی ممکن ہے۔ اس کے سوا اور کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اُن واقعات کو لکھ کر بعد والوں کے سامنے پیش کر دیتے، جب بھی روایت ہی ہوتی، زبانی کہا، جب بھی روایت ہوئی، اسی طرح جس طرح وہ واقعات صحابہ کے توسط سے تابعین کو ملے، بالکل اسی طرح تابعین سے تبع تابعین کو وغیرہ۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی عدالت و صداقت کی شہادت تو صرف قرآنِ پاک سے ثابت ہے۔ انھیں کی شان میں رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ آیا[۱] یعنی یہ اللہ سے راضی ہیں اور اللہ ان سے اور فرمایا گیا، ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ[۲] یعنی اللہ تعالیٰ نے (اے رسول کے ساتھیو!) ایمان کو تمھارا محبوب بنا دیا اور اسے تمھارے دلوں میں مزیّن کر دیا اور کفر و بدکاری و گناہ کو ایسا بنا دیا کہ تمھیں ان سے کراہت ہونے لگی۔ پھر مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ سے اَجْرًا عَظِیْمًا[۳] تک پڑھ جائیے۔ پھر سورۂ احزاب میں وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا سے لِیَجْزِیَ اللّٰهُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِهِمْ تک تلاوت کر جائیے۔ غرض یہ کہ صحابۂ کرام خصوصاً مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین کی مدح و ثناء سے اس قرآنِ ناطق کو بہت زیادہ تر زبان پائیں گے۔ باقی رہے وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ، تو ان کے لیے بھی رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ یعنی وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وہیں پر موجود ہے[۴]۔

غرض یہ ہے کہ ہر روایت اپنی اصلیت کے اعتبار سے: اگر وہ قرآنِ پاک کی مخالف نہیں، تو قطعی الاصل ہو سکتی ہے، کیوں کہ جنسِ واقعات کا وجود قطعی، جنسِ روایت کا وجود قطعی، مگر افرادِ روایت یعنی یہ روایت اور وہ روایت قطعی نہیں، کیوں کہ ہم تک یا جامع روایات تک قطعی ذرائع سے نہیں پہنچتی، اس لیے ہر روایت قطعی الاصل ہو سکتی ہے، مگر چوں کہ ہم تک ظنی ذرائع و وسائط سے پہنچتی ہے، اس لیے ہمارے لیے ظنی ہے، مگر یہی روایت صحابہ کے لیے ظنی نہ تھی[۵] اور تابعین کے لیے بھی ظنی نہ تھی خصوصاً جب روایت کو کسی تابعی نے

---

۱ مائدہ ۲ حجرات ۳ فتح ۴ یہ بالکل صحیح ہے لیکن حصر نہیں کہ اس وقت کے سب مسلمان انھیں صفات سے متصف تھے جہاد میں کم زوری دکھانے والے، آپ پر غلّ کا گمان کرنے والے، اور اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا اِلَیْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا وغیرہ ذٰلک من الآیات کے مرتکب بھی مدینۃ النبی ہی میں موجود تھے اور ایسے لوگوں کے ماتھے پر کوئی نشان نہیں تھا کہ ان سے روایت قبول نہ کی جاتی۔ (مدیر)

۵ اگر ظنی نہ تھیں، تو جناب عمر رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ وغیرہ راویوں سے قسمیں کیوں اٹھواتے تھے، گواہ کیوں طلب کرتے تھے؟ جیسا کہ آگے چل کر آپ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ (مدیر)

مہاجرین وانصار میں سے کسی سے سُنا ہو، اس لیے یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ہر روایت بشرطیکہ مخالف قرآن پاک نہ ہو،[۱] قطعی لذاتہا ہو سکتی ہے، مگر اس وقت ہمارے سامنے ظنی بغیرہا ہو کر آگئی ہے، اس لیے اس کی لذاتہا قطعیت کے امکان سے بالکل بے اعتنائی نہیں برتی جا سکتی اور عام طور سے ہر روایت کو ظنی کہہ کر ٹھکرا نہیں دیا جا سکتا۔[۲]

اسی طرح دلیل میں جو اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا کو پیش کیا جاتا ہے، تو اس آیت کے مفہوم صحیح کے سمجھنے میں بھی دھوکا کھایا جاتا ہے۔ یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ جب ظن کا مقابلہ حق سے ہو تو حق یعنی یقینی بات کے مقابل ظنی بات کچھ کام نہیں دے سکتی۔ اسی آیت کریمہ کے مطابق میں نے اپنی اس تحریر میں جہاں بھی کسی روایت کی طرف اشارہ کیا، تو پہلی شرط مطابقت قرآن یعنی عدم مخالفتِ کتاب اللہ کی لگا دی، کیوں کہ قرآن پاک ہر حیثیت سے قطعی ہے، کسی حیثیت سے بھی ظنی نہیں اور روایت صرف اسی حیثیت سے قطعی ہے کہ جنس روایت کا وجود قطعی ہے، مگر کسی فرد روایت کی قطعیت قطعی نہیں، بلکہ بوجہ امکان کے یہ بھی ظنی ہے، کیوں کہ ذرائع و وسائط اس کے ہم تک پہنچنے کے ظنی ہیں، تو جو روایت بھی قرآن پاک کے مطابق نہ ہو، بلکہ مخالف ہو، وہ قرآن پاک کے مقابل یقیناً ٹھکرا دینے ہی کے قابل ہے۔[۳]

مگر جو روایت قرآن پاک کے مطابق ہو، قرآن پاک کی تبیین و توضیح کر رہی ہو، قرآن پاک کی تعلیم ہو، وہ تو کسی حق سے متصادم نہیں، پھر اس کو لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا کا مصداق کہہ کر کیوں ٹھکرایا جائے گا؟ اگر اپنی سمجھ اور اپنی اُپج ہی کو حق قرار دے دیا جائے، جب تو جتنی عقل اتنی ہی سمجھ اور پھر اتنی ہی اُپج۔ اب کس کس کو حق قرار دیں گے؟

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ الآیہ[۴] ۔ اس آیہ کریمہ کے مخاطب اولیٰ اگرچہ صحابہ کرام ہیں (رضی اللہ عنہم اجمعین)، مگر جب یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر تمام مومنین سے کہا جا رہا ہے کہ اپنی آواز رسول صلعم کی آواز پر بلند نہ کرو، تو کیا کسی مسلمان کے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ جس مسئلہ میں رسول اللہ صلعم کا ارشاد گرامی ایک شخص بیان کر رہا ہے، کوئی مسلمان بھی اس کی طرف سے بے اعتنائی

---

[۱] اس کا فیصلہ کون کرے؟ ——— اور کیا پھر وہ وحی بن جائے گی؟ بس یہی راہ ہے جس سے شیعوں کی وحی خفی الگ ہو گئی، سُنیوں کی الگ۔ (مدیر) [۲] علم جزاء (مدیر) [۳] یہ سچ ہے (مدیر) [۴] یہ حل ہے اس چیز کا جس سے کوئی ہدایت خواہ انسان مستغنی نہیں ہو سکتا۔ (مدیر) [۵] حجرات۔

جرأت کرے کہ اُس کے خلاف اپنی رائے ظاہر کرنے کی ہمت کرے؟ حاشا وکلا! کسی مسلمان سے یہ نہیں ہو سکتا۔[۱]

اتنا ضرور ہے کہ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ جب اکثر راویانِ حدیث مجروح اور منسوب بکذب ووضع ہیں، تو اِذَا جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا[۲] کے مطابق پہلے تحقیق کرے کہ آیا واقعی یہ ارشادِ رسول ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اگر ہو سکتا ہے، تو ہے یا نہیں؟ بُعدِ زمانہ کی وجہ سے اگر قطعیت کے ساتھ اس قول کے ارشادِ رسول ہونے کا یقین نہیں ہو سکتا ہے، تو اسی طرح اگر وہ قول مخالفِ قرآن نہیں ہے اور تعلیم وتبیین کتاب ہو سکتا ہے تو اس کے ارشادِ رسول صلعم نہیں ہونے پر بھی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا، بلکہ مطابقِ قرآن ہونے کی وجہ سے زیادہ گمان اور ظنِ غالب اس کے قولِ رسول ہی ہونے کا کیا جائے گا اور یقیناً اس کے خلاف اظہارِ رائے اور عمل رَفْعُ الصَّوْتِ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ ہو جائے گا، جس کی وجہ سے حبطِ عمل کا خطرۂ عظیم ہے۔

اہمیتِ نسبت اس کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا ہر مسلم کا فرض ہے کہ قرآن پاک کی کسی آیت کے ایک معنی جو قرآن پاک کے بالکل موافق، سیاق وسباق کے مطابق ہیں، رسول اللہ صلعم کے بیان کردہ کہے جاتے ہیں اور دوسرے معنی جو بالفرض اُسی درجے کے ہیں، یعنی، قرآن کے موافق اور سیاق کے مطابق ہی ہیں، مگر اُس قولِ منسوب بہ رسول صلعم کے مخالف یا مغائر ہیں، تو لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ والی آیت کے رو سے اس کو معنی منسوب بہ رسول صلعم کے مقابل اپنے معنی بیان کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ہاں اگر اس کے بیان کردہ معنی موافقتِ قرآن ومطابقتِ سیاق وسباق میں ترجیح رکھتے ہیں، جو دوسرے صاحبانِ بصیرت کے نزدیک بھی مرجح ہوں، تو یقیناً اُس قول مرجوح کی نسبت ہی رسول صلعم کی طرف غلط سمجھی جائے گی۔ اور وہ روایت غلط ہوگی اور غلط سمجھی جائے گی، اس لیے اس روایت کو اس وجہ سے غلط قرار دے کر اپنا فہمیدہ مطلب بیان کرنا اس آیت کا مصداق نہ ہوگا۔[۳]

اتنی تشریح وتوضیح سے روایت کی ضرورت اور روایت کی اہمیت (بشرطیکہ وہ روایت قرآن کے خلاف نہ ہو) ایک عقلِ سلیم کے سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ اب میں تصویر کا ایک رُخ دکھا چکا، اب دوسرا رُخ ملاحظہ ہو!

---

[۱] یہاں آپ صَوْت (آواز) کو کھینچ کر کہاں سے کہاں لے گئے؟ اگر یہی مطلب ہے کہ آپؐ سے اختلافِ رائے نہ کیا جائے، تو شاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ کی تعمیل کیوں کر ہوگی؟ آپ کے مضمون میں یہ باتیں پڑھ رہا ہوں اور متعجب ہو رہا ہوں۔ شاید لَا تَفْعَلْ عَلَی الْحَد، لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ، قَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّتِیْ الخ وغیرہ آیات کے حدیثی وتفسیری بیانات اس وقت آپ کے سامنے نہیں۔ (مدیر) [۲] حجرات [۳] یہ عجیب معیار غالباً تنہا آپ کا مجوزہ ہے۔ (مدیر)

تصویرِ روایات کا دوسرا رُخ

اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تقریباً تیئس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فیض صحبت سے مستفیض ہوتے رہے اور علماً وعملاً دین کی ساری باتیں قولاً وفعلاً سیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ تعالیٰ کے ذریعے تمام صحابہ میں دین کلاً وجزواً ہر طرح مروج ہوگیا اور اس وقت سارے مسلمان ہدایت قرآن پاک وتعلیم وتبیین رسول صلعم کے مطابق دین پر چلنے لگے اور چل رہے تھے۔ اب جب کہ رسول صلعم اپنا فرض انجام دے چکے اور اپنا کام پورا کر چکے، تو اس عالم سے تشریف لے گئے۔ کُلُّ نفسٍ ذائقۃ الموت صلی اللہ علیہ و آلہ و بارک وسلم۔

آپ کے بعد آپ کی تعلیم وتبیین کے مطابق تمام صحابہ قرآن پاک پر عمل کر رہے تھے۔ عقائد وعبادات میں کسی قیاس واجتہاد واختراع واحداث کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ رسول صلعم کا فریضۂ اولین یہی تھا کہ عقائد وعبادات جو "دین لذاتہا" ہیں، یعنی بلاواسطہ نجاتِ آخرت کے لیے ان کی پابندی اختیار کی جاتی ہے اور محض ابتغاءً لمرضاۃ اللہ ہی ان کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ کسی اور نیت سے ان کی پابندی جائز نہیں اور جن کا علم صحیح بغیر تعلیم کتاب ورسول کسی کو کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ وَمَا كَانَ اللهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ[1] یعنی، اللہ تم میں سے کسی کو بھی عالمِ غیب کے حالات سے مطلع کرنے والا نہیں، البتہ اللہ اپنے رسولوں میں سے اس کے لیے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے؛ ان وجوہ کی بنا پر رسول صلعم کے بعد صحابہ رض کے پاس کوئی ذریعہ علم آخرت کے نفع ونقصان سے متعلق (بجز اس قدر کے جتنا بھر قرآن میں مذکور تھا یا رسول صلعم سے معلوم ہوا تھا) نہ تھا پھر وہ ایسی باتیں جن کا تعلق صرف معادِ آخرت سے ہے، کیوں کر قیاس واجتہاد کر سکتے تھے اور کس طرح کوئی احداث واختراع فرما سکتے تھے؟

البتہ حقوق ومعاملات جو "دین لغیرہا" ہیں، یعنی اگر ابتغاءً لمرضاۃ اللہ ان کی نگہداشت حسب قانونِ قرآنی کی جائے، جب تو دین میں مفید ہوں گے، اور نہ اگر یہ نیت نہیں ہے، جب بھی اگر قانون قرآنی کے مطابق ان کی نگہداشت رکھی گئی، تو چاہے جس نیت سے بھی ہو (بشرطیکہ وہ نیت

---

[1] آل عمران ۱۷۹ یہ "دین لذاتہا" اور "دین بغیرہا" محتاجِ سند ہے۔ (مدیر)

خود بذاتہا حرام نہ ہو) دنیاوی اعتبار سے کارِ خیر ہی ہے اور اس کے متعلق کوئی بازپرس نہیں۔ غرض یہ کہ حقوق و معاملات میں آئے دن شخصی واقعات ایسے ایسے آئیں گے اور آتے رہیں گے کہ ہر واقعہ کی جزئیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بالکل مطابق کوئی آیت یا کوئی تعلیم نبوی کی جستجو یقیناً محال عقلی ہے۔ اس لیے ضرورت قیاس و اجتہاد کی پڑے گی اور صحابہ رض کو معاملات کے فیصلے کرنے میں قیاس و اجتہاد کی ضرورت پڑی۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی صحابی نے خلیفۂ وقت سے کہا کہ اسی قسم کا معاملہ میری موجودگی میں رسول اللہ صلعم کے سامنے پیش ہوا تھا، تو آپ نے اس وقت یہ فیصلہ دیا تھا۔ اگر وہ روایت قرآن پاک کے خلاف نہ ہوئی۔ تو خلیفۂ وقت نے پوچھا کہ تمہارے اس بیان کے گواہ بھی ہیں؟ اگر وہ دو گواہ دوسرے دو صحابیوں کو لے آیا، تو اس کی بات مان لی گئی، یا خلیفۂ وقت کو اس کے بیان سے قرآن پاک کی کوئی آیت بھی سند میں یاد آ گئی یا کسی دوسرے صحابی نے یاد دلادی تو اب ضرورت گواہی کی کیا رہی، ورنہ اگر وہ گواہ نہ لا سکے، تو پھر اس بیان کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے خلیفہ نے اپنے قیاس و اجتہاد سے کام لیا۔

اور اگر اس صحابی کا وہ قول قرآن کے خلاف نظر آیا۔ تو حضرت علی مرتضیٰ رض کی طرح صاف کہ دیا کہ لا نترک کتاب ربنا بقول اعرابی، یعنی، ہم اپنے رب کی کتاب کو ایک بدو کے کہنے کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ وہ بدو جھوٹا ہو سکتا ہے، مگر کتاب اللہ چھوڑی نہیں جا سکتی۔

عہدِ صحابہ میں روایت غرض یہ کہ عہدِ صحابہ رض میں رسول اللہ صلعم کے بعد روایت کی ضرورت صرف فصل خصومات اور تصفیۂ معاملات ہی کے وقت محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی خلیفۂ وقت یا جن کے ہاتھ میں اس وقت کسی مشکل معاملہ کا تصفیہ ہوتا، تو دوسرے صحابہ سے پوچھتے کہ کسی کو یاد ہے کہ اس قسم کا کوئی مقدمہ رسول صلعم کے سامنے پیش ہوا ہو اور آں حضرت صلے نے کوئی فیصلہ فرمایا ہو؟

تصریح ضرورت اور یہ ضرورت کیوں پڑتی تھی؟ صرف اس لیے کہ حتی الوسع وہ احتیاط کرتے تھے اور اپنے کو خواہ مخواہ کے قیاس و اجتہاد سے بچاتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جب تک اُسوۂ نبویہ مل سکے، ہم بطورِ خود کوئی راہ اختیار کریں، اس لیے جہاں قیاس و اجتہاد کا موقع ہوتا بھی، پہلے پوچھ لیتے تھے کہ مجھ سے پہلے خود رسول صلعم نے بھی ایسے معاملہ کے متعلق اگر کوئی فیصلہ دیا ہے، تو بہتر ہے کہ وہی فیصلہ یہاں بھی رہے، ورنہ مجبوراً قیاس و اجتہاد سے کام لیا جائے۔

ہاں اگر روایت ایسی ملی، جو قرآن کے خلاف ہے تو فوراً وہ روایت[۱] رد کر دی گئی، یعنی یہ سمجھ کر رد نہیں کیا کہ نعوذ باللہ رسول صلعم نے قرآن کے خلاف یہ فیصلہ کیا ہے، اس لیے نہیں مانا جائے گا، بلکہ یہ سمجھتے ہوئے اس روایت کو رد کیا کہ راوی غلط بیان کر رہا ہے، عام اس سے کہ راوی کو جھوٹا سمجھا یا ضعیف الحافظ سمجھا یا بے وقوف سمجھا۔

بے ضرورت روایت اور بے ضرورت روایت بہ طور تذکرہ و ذکر خیر کہ جب مجمع میں بیٹھے، تو روایتیں بیان کرنے لگے کہ رسول صلعم نے یوں فرمایا اور اس طرح کیا، وغیر ذلک۔ اس کا مشغلہ تھا اور ضرور ہوگا، کیوں کہ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ، یعنی جو جس کو زیادہ محبوب رکھتا ہے، اس کو بہت زیادہ یاد کیا کرتا ہے۔ صحابہ رضؓ کو جو محبت رسول صلعم سے تھی، پوشیدہ نہیں، اس لیے یقیناً تابعین کی جماعت میں ہر صحابی جب بیٹھتے ہوں گے، رسول صلعم کا ذکر خیر ضرور کرتے ہوں گے اور تابعین بھی اُن سے ذرا ذرا بات ضرور پوچھتے ہوں گے، مگر یہ محض بہ تقاضائے محبت ذکر خیر ہی کے رنگ میں ہوتا تھا۔ اس کو دین کی تبلیغ نہیں سمجھتے تھے، مگر اکابر صحابہ ضرور اس سے ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آگے چل کر اس سے دین میں کوئی رخنہ پڑے اور لوگ کتاب اللہ سے غافل ہو جائیں۔ اسی لیے امیر المؤمنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ وجزاہ عنا وعن سائر المسلمین جزاءً حسناً روایت[۲] حدیث پر اکابر صحابہ پر برابر تشدد فرماتے تھے اور سختی سے صحابہ رضؓ کو اس سے روکتے تھے اور صاف فرما دیا کرتے تھے کہ حَسْبُنَا کِتٰبُ اللّٰہِ، یعنی ہم لوگوں کے لیے کتاب اللہ کافی ہے۔

فتنۂ روایت

حضرت امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے عہد مبارک میں جو ایران فتح ہوا، تو اہلِ ایران پر اس کا بے حد اثر پڑا اور پڑنا تھا، کیوں کہ عرب کا اکثر خطہ ایران کا باج گذار تھا۔ حجاز باج گذار نہ تھا، تو کم از کم ایک حد تک زیر اقتدار ضرور تھا اور ایران اُس وقت کے متمدن ترین ملکوں میں تھا، فنونِ حرب واسالیب جنگ کے ماہرین، یہ کہا جا سکتا ہے، اُس وقت ایران سے بہتر

---

[۱] تو مطلب یہ ہوا کہ آں حضرت کی وفات کے فوراً بعد جھوٹی روایتیں شائع ہونی شروع ہو گئی تھیں (مدیر)

[۲] یہاں کوئی تخصیص و تمیز نہیں کہ فلاں قسم کی روایت کیا کرو اور فلاں قسم سے محترز رہو (مدیر)

دنیا کے کسی حصہ میں نہ تھے، مگر مٹھی بھر عربوں نے نہایت قلیل مدت میں اس طرح پورے ایران پر تقریباً غلبہ و تسلط حاصل کرلیا اور ایسا تسلط حاصل کیا کہ ایران کسی طرح بھی اُن کے پنجۂ اقتدار سے نکل نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ آج تک اُس وقت سے ایران مسلمانوں ہی کے قبضے میں ہے اور ان شاء اللہ رہے گا۔

ایران کے بعض مدبرین نے انتقام کی ۔ اہیں سوچیں، مگر اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہ نکلی کہ کچھ ایسے نوجوان منتخب کیے جائیں، جو ایران و عرب کے تجارتی و سیاسی تعلقات کی وجہ سے عربی زبان سے بھی آشنا ہوں اور ایران کے علوم متداولہ یعنی رمل و نجوم و جفر وغیرہ میں جن کا ایران میں بہت رواج تھا، معقول مہارت رکھتے ہوں اور فنونِ حرب وغیرہ سے بھی باخبر ہوں اور ہوشیاری و چالاکی، مکر و فریب، لباقی و عیاری میں بھی ممتاز ہوں۔

غرض ایسے نوجوان ایک معقول تعداد میں ایران کے مختلف شہروں اور دیہاتوں سے چُن کر مہیا کیے گئے اور مناسب ہدایتیں اور تعلیمیں اُنھیں دی گئیں اور مدینہ طیبہ کی طرف سب کو روانہ کر دیا گیا۔ یہ مدینہ پہنچ کر حضرت امیر المومنین فاروق اعظم رض کے حضور میں حاضر ہو کر مشرف . . اسلام ہوئے، کیوں کہ بہ ظاہر اسی ارادہ سے آئے تھے۔ یہ سب مسلمان ہونے کے بعد تعلیمِ قرآن کے لیے حضرت ابو ہریرہ رض کے سپرد ہوئے . . اور وہ انھیں تعلیمِ قرآن کرنے لگے۔ جب تک یہ لوگ صحابہ رض اور یہاں کے مسلمانوں کا اندازہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا اصولِ زندگی کیا ہے اور کس طرح رہتے ہیں اور کہاں کہاں پانی مر سکتا ہے؟ چند ہی دنوں کے بعد اس کو خوب محسوس کرلیا کہ جب تک حضرت فاروق اعظم رض زندہ ہیں، ہم لوگوں کی کوئی ریشہ دوانی کامیاب نہیں ہو سکتی اور ان کو عداوت بھی سب سے زیادہ اُن ہی سے تھی، کیوں کہ ایران کی فتح ان ہی کی سیاست دانی اور دُور اندیشی کا نتیجہ تھی، مگر یہ لوگ اپنی جماعت میں سے کسی ایک کے ہاتھ سے بھی ایسا کام ہونا مناسب نہیں سمجھتے تھے، جس سے یہ ان کی جماعت بدنام یا مشتبہ ہو جائے۔ اس لیے اس جماعت نے اُن اُساریٰ (قیدیوں) کو اپنا ہم راز بنایا، جو ایران سے جنگ کے موقع پر فتوحات کے سلسلے میں آئے تھے اور چوں کہ اہل ایران نے ان کا فدیہ نہیں دیا اور احسان کر کے چھوڑ دینا مناسب وقت نہ تھا، اس لیے وہ زرِ فدیہ میں رہن، غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ خصوصاً وہ بہت آسانی سے اس جماعت کے ہم راز اور شریکِ مکر و فریب ہو گئے، جو قیدی کہ مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اپنے آبائی مذہب پر تھے جن میں فیروز ابو لؤلؤ بھی تھا۔ مورخین جو وجہ بھی لکھ دیں کہ اس کو فلاں وجہ سے

عداوت بھی، مگر درحقیقت وہ فقط ایک ظاہری بہانہ تھا۔ اصل حقیقت اور حقیقی راز کو اُس قاتل ملعون نے افشا نہیں کیا، بلکہ ایک مصنوعی وجہ کا اعلان کیا گیا اور پھر روایات نے اور بھی اس غیر حقیقی وجہ کو حقیقی بنا کر چمکایا اور اصلی وجہ پر پوری طرح پردہ ڈالا، کیوں کہ روایات کا سرچشمہ تو پھر یہی جماعت بنی، جس کی تشریح آگے آتی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ اس جماعت منافقین نے اپنا رسوخ تو صحابہ اور عام مسلمانوں میں خوب خوب قائم کیا اور اپنے ہر فرد کو ایک مخلص مسلمان ثابت کر لیا، مگر ابولؤلؤ فیروز کے ہاتھوں امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو آخر شہید کرا چھوڑا۔

اب انتخابِ خلیفۂ ثالث کے وقت ان منافقین قاتلہم اللہ فی الآخرہ نے چاہا کہ یہ موقع مسلمانوں میں انتشار ڈالنے کا ہے، اس وقت کچھ کرنا چاہیے، مگر کوئی مفید مطلب راہ نہ نکلی اور حضرت امیر المومنین ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہو گیا۔

یہ ایرانی منافقین کی جماعت اس انتخاب کے وقت تو کوئی کام یاب فتنہ برپا نہ کر سکی، مگر اس نے اس انتخاب ہی کو اپنا مرکزِ دور فتنہ بنایا اور نوجوانانِ بنی ہاشم میں اس انتخاب کے خلاف نہایت دانش مندانہ ریشہ دوانی آہستہ آہستہ شروع کی، مگر دیکھا کہ مدینہ طیبہ میں ابھی فیض یافتگانِ صحبتِ رسول کی کافی جماعت موجود ہے، اس لیے یہاں اگر سرگرمی زیادہ دکھائی، تو مشتبہ ہو جائیں گے، اس لیے یہ جماعت مصر، عراق، شام، کوفہ، بصرہ اور مختلف مقامات میں منتشر ہو گئی اور وہاں انقلاب پیدا کرنے کی ریشہ دوانیاں اُسی ایرانی قدیم اصول کے مطابق شروع کر دیں۔

ایران کا یہ دستور تھا کہ جب کبھی موجودہ حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی ضرورت کسی شخص یا جماعت کو محسوس ہوئی، تو موجودہ سے پیشتر جو خاندان برسرِ اقتدار تھا، اُس کے کسی ممتاز فرد کو لے کر اُچھالتے تھے اور عام پبلک میں اس کا پروپیگنڈا کرتے تھے کہ یہ حکومت موجودہ افراد نے اس کے اصلی مستحق اور حقیقی حق دار کے حق کو غصب کر کے حاصل کر لی ہے۔ اس حکومت کا اصلی حق دار یہی شخص ہے اور اس خود ساختہ حق دار کے فضائل و مناقب کا زبردست طور سے عوام میں خوب خوب اشتہار و اعلان کیا جاتا تھا اور موجودہ برسرِ اقتدار اشخاص کے قبائح و مثالب کی تشہیر کی جاتی تھی۔

بالکل اسی طرح یہ منافقین ایران میں دُور دُور مقامات اور قصبات و دیہات میں گھوم گھوم کر

بظاہر تو تعلیم دین و تبلیغ قرآن کے لیے پھرتے تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ موجودہ خلیفہ ثالث حضرت امیر المؤمنین ذو النورین رضی اللہ عنہ کے خلاف آہستہ آہستہ موقع موقع سے زہر افشانی بھی کرتے رہتے تھے، اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو ان کے مقابل حق دار بنا کر دکھاتے تھے کہ اصل حق دار خلافت یہی تھے، مگر انتخاب میں ارباب انتخاب نے غداری سے (نعوذ باللہ) کام لیا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب ضرورت اور واقعیت سے زیادہ خوب خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے جاتے تھے۔ قرآن پاک کی اکثر آیتوں کا مورد ان ہی کو ثابت کرتے، اور ان کی شان میں جھوٹی جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر لوگوں کو سناتے۔ وغیر ذلک۔

ابتدائی دور تو اسی قدر گذرا، مگر رفتہ رفتہ جہاں خاندان بنی اُمیہ کے افراد برسر اقتدار تھے، ہر ایک کے خلاف ریشہ دوانی شروع کر دی اور پھر مدینہ پہنچ کر اور اُن مقامات بعیدہ سے وہاں کے مقامی لوگوں کو بھیج بھیج کر ان کے فرضی مظالم کی داستانیں مدینہ طیبہ میں سنانے اور سنوانے لگے اور شکایات بھی بارگاہ خلافت میں مسلسل بھیجتے رہے، بنی ہاشم کو اُبھارتے رہے کہ چونکہ خلیفہ وقت خود بنی امیہ میں سے ہیں، اس لیے اپنی قرابت والے عُمال کی اس قدر شنیع باتیں سنتے ہیں اور پھر بھی کوئی صحیح انسداد نہیں کرتے، حالاں کہ حضرت امیر المؤمنین ذو النورین رضہ شکایات کا حال پوری دریافت و تحقیق کے بعد خوب اچھی طرح سمجھتے تھے، اور ان کو پتہ لگ گیا تھا کہ یہ سب مخالفین کی ریشہ دوانیاں ہیں: اس لیے وہ غلط شکایات پر کیا انسداد کرتے؟ اور اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ ان عمال کو بدل دینے سے ریشہ دوانی ختم ہو جائے گی، تو وہ یہ بھی ضرور کر دیتے، مگر اس کے بعد تو اور بھی میدان صاف ہو جاتا اور وہ اُن مقامات میں جہاں ان عمال کی وجہ سے کھُل کر اپنا کام نہیں کر سکتے تھے، ان کے ہٹا دیے جانے کی وجہ سے اور کھُل کھیلتے، اس لیے وہ شکایتوں کو سن کر چپ ہو جاتے اور بنی ہاشم کے خیالات کچھ اس وجہ سے اور کچھ اُن منافقین کی ریشہ دوانیوں کے اثرات سے ان کی طرف سے خراب ہوتے جاتے تھے، حتیٰ کہ حضرت علی رضہ مرتضیٰ تک متاثر ہونے سے نہ بچ سکے۔

غرض تقریباً دس سال کی جدوجہد کے بعد یہ ایرانی منافقین کی جماعت مصر سے

کچھ باغیوں کی ایک ٹولی کو مدینہ طیبہ بھیجنے میں کام یاب ہوئی جس نے مدینہ طیبہ میں بغاوت کا فتنہ برپا کیا اور حضرت امیرالمومنین ذوالنورین رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو شہید کرڈالا بنی ہاشم بدگمانیوں کے اثر سے متاثر تھے ہی، اگر شریک بغاوت سب کے سب نہ ہو سکے، تو بہت حد تک علیحدہ ہی رہے۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر جیسے دو ایک تو مستقل طور سے اس فتنہ میں شریک رہے اور یہی تو اس فتنہ کے آلہ کار بنے یا بنلے گئے

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا فتنہ ان ہی ایرانی منافقین کا تھا، جس میں بہتیرے اکابر بھی سان لیے گئے اور بعض تو یقیناً فی الواقعہ سننے نہ تھے، مگر مؤرخین نے اُن ہی راویوں کی روایتوں کی بنا پر بعض غیر متعلق اکابر کے نام بھی متعلقین میں درج کر دیے۔ مگر یہ سب تاریخ کو صحیح مان لینے کے بعد، ورنہ اللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

مجھے چوں کہ ان واقعات کی تشریح اس وقت مطلوب نہیں۔ اس لیے زیادہ تفصیل و حوالہ جات سے پرہیز کرتے ہوئے اصل مقصد کی طرف آتا ہوں۔ اتنی طویل تمہید بھی ضرورت کی بنا پر ضمناً ہو گئی۔ ناظرین معاف فرمائیں۔

منافقینِ ایران کی جدّوجہد کے نتائج بد | غرض یہ کہ حضرت امیرالمومنین ذوالنورین کی شہادت کے بعد جنگ صفین و جمل وغیرہ کے ہنگامے اور مسلمانوں کی خانہ جنگیاں، پھر امیرالمومنین حضرت علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہ کو مدینہ طیبہ سے کوفہ کھینچ بلانا اور وہاں اُن کو طرح طرح کی ایذائیں دینا، پھر انھیں بھی شہید کرڈالنا، پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے لڑنے پر آمادہ کرنا، مگر ان کا نہ لڑنا اور مصالحت کر لینا اور اس جرم مصالحت کی سزا میں اُن کو بھی زہر دے کر شہید کرڈالنا اور پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مدینہ طیبہ سے کوفہ سینکڑوں خطوط لکھ لکھ کر بُلانا اور بُلا کر غداری کرنا اور ان کو بھی عبداللہ بن زیاد کی تیغ حرص و آز سے شہید کرا دینا، غرض یہ سب کچھ ان ایرانی منافقین نے کیا اور اس حد تک مسلسل جدوجہد اور مسلسل فتنہ کوشیوں کے ساتھ نہایت ہوش گوش سے کیا کہ اگر کوئی دوسری قوم ہوتی، تو خدا جانے کب کی فنا ہوئی رہتی اور دنیا میں اس کا کہیں نام ونشان باقی نہ رہتا، مگر چوں کہ مسلمان آخری اُمت اور دینِ محمدی آخری دین اسلام ہے، اس لیے تو قیامت تک رہنا

ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو بچالیا، ورنہ ان منافقین نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔

جب حضرات حسنینؓ کی شہادت کے بعد بھی خصوصاً حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد بھی ان منافقین نے دیکھا کہ اللہ اکبر! ان کے رسول کا نواسہ مارا گیا۔ ساری دنیائے اسلام میں یہ خبر بے حد رنج وملال کے ساتھ سنی گئی، مگر پھر بھی اور جگہیں تو اور جگہیں تھیں، مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں کسی نے اپنے قبضۂ تیغ پر ہاتھ تک نہ رکھا اور خلیفۂ وقت کے خلاف کہیں کوئی بغاوت اس خبرِ شہادت کے سننے کی وجہ سے نہ ہوئی۔ ابھی تو رسول اللہ صلعم کی وفات کو صرف پچاس سال ہی گذرے ہیں، کتنے صحابہ اور بعض ازواج مطہرات تک ابھی زندہ ہیں، رضی اللہ عنہم اجمعین۔ لیکن سب کے سب خبرِ شہادت سن کر صرف رو دھو کر رہ گئے! یہ منظر ان منافقین کے لیے بے حد باعثِ حیرت و استعجاب تھا کہ یہ قوم عجیب وغریب قوم ہے، اشخاص پرستی سے اس قدر پاک تو دنیا میں کوئی جماعت دیکھی ہی نہیں گئی۔ یہ فقط اصول جانتی ہے اور جان دینے کے لیے ہمہ دم تیار ہے مگر حکمِ خدا کے مطابق۔ جب تک حکمِ خدا ثابت نہ ہو، اُس وقت تک کیسا ہی عزیز ترین شخص کیوں نہ مارا جائے۔ یہ صبر کرکے رہ جائیں گے اور کبھی اپنے آپے سے باہر نہ ہوں گے۔

آخر کئی سال کی لگاتار جدوجہد اور پروپاگنڈے اور واقعات کربلا کی تصنیف کردہ مفصل داستانِ ظلم کی کافی تبلیغ و اشاعت کے بعد جو واقعہ حرہ ہوا بھی تو ایک تو کئی سال کے بعد اور پھر وہ بھی سعی ناکام ہی رہی۔

البتہ واقعہ کربلا باوجود حد سے زیادہ مبالغہ آمیز غلط بیانیوں کے اتنی کافی اہمیت ضرور رکھتا ہے کہ آخر اُن ہی منافقین ایران اور اُن کے شاگردانِ رشید کی ریشہ دوانیوں کی بدولت ایک مدت دراز تک مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگیوں کا ذریعہ بنا رہا اور بالآخر حکومت اسلامیہ بنی امیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے استیصال کا ذریعہ بن کر رہا اور کسی نہ کسی طرح بنی عباس کی نیم اسلامی حکومت اس واقعہ کے پروپاگنڈے کی بدولت قائم ہو کر رہی۔

قرآن چھین لینے کی جدوجہد | حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان منافقین ایران نے اس کو خوب اچھی طرح محسوس کرلیا کہ مسلمان ہزار آپس میں لڑیں، مگر کبھی کم دور

نہیں ہو سکتے۔ اس قوم کو کوئی ہزار مارنا چاہے، یہ قوم اس وقت تک کبھی نہیں مر سکتی، جب تک اس کے پاس قرآن موجود ہے، اس لیے جس طرح بھی ممکن ہو، اس قوم کے ہاتھ سے اس سے قرآن کو چھین لینا چاہیے۔

مگر قرآن تو ہر مسلمان کے گھر میں موجود ہے، کیوں کہ ہر گھر میں بوڑھا، بچہ، جوان، عورت، مرد سب پڑھتے ہیں اور اگر ہر گھر میں نہیں، تو ہر محلہ میں متعدد حافظ پورے قرآن کو اپنے سینے میں محفوظ رکھنے والے موجود ہیں، اس لیے اس قوم سے قرآن کا چھین لینا تو محال تھا اور آج تک محال ہے اور قیامت تک محال رہے گا۔

تو اس دشواری کو محسوس کرتے ہوئے ایرانی منافقین اور ان کے شاگرد ابن رشید نے یہ صورت نکالی کہ کسی طرح کوئی دوسری چیز ایسی ان مسلمانوں کے سامنے پیش کی جائے جو قرآن کا بدل ہو سکے اور اس کی اہمیت اُن کے خواص نہ سہی، ان کے عوام ہی پر اتنی ثابت کی جائے کہ یہ لوگ قرآن سے زیادہ اُس بدل قرآن کی طرف جھک پڑیں۔

آغاز روایاتِ کاذبہ | روایات حدیث کا رواج تو حضرت امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بعد بہ سبیلِ تذکرہ محبت و ذکر خیر عام طور سے ہونے لگا تھا۔ اب کوئی فاروق اعظم جیسا دُور اندیش روک ٹوک کرنے والا تو رہا نہ تھا، اس لیے عام صحابہ تابعین کے مجمع میں اکثر رسول اللہ صلعم کے حالات اور اقوال و افعال بیان کیا کرتے تھے۔

پھر یہ منافقین ایران حضرت امیر المؤمنین علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب کی جھوٹی روایتیں اور اہلِ بیت رسول صلعم کے معنی بدل کر فضائلِ اہل بیت کی روایتیں خوب خوب گھڑ گھڑ کر کوفہ، بصرہ، عراق و شام اور مصر وغیرہ میں کافی طور سے مشہور کر چکے تھے۔ قرآن پاک کی شان نزول کے متعلق من گھڑت روایتیں بنا بنا کر سینکڑوں آیتوں کا مورد حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن، حضرت حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کو قرار دے کر اچھی طرح شائع کر چکے تھے اور عوام کا رجحان ان روایتوں کی طرف محسوس کر چکے تھے۔ ان کے تلامذہ ان روایتوں کی تبلیغ و اشاعت میں اس قدر منہمک ہی تھے۔ اس لیے یہ بات آسانی سے ذہن میں آگئی کہ ان ہی روایاتِ موضوعہ کے ذریعہ مسلمانوں کی توجہ قرآن پاک

کی طرف سے پھیر کر ان کو روایات مختلفہ کے انبار کے نیچے دبا دیا جائے... کی طرف سے پھیرکران کو روایات مختلفہ کے اُجھاڑے میں ڈال دینا چاہیے اور ان ہی روایات کے ذریعے قرآن کو جس حد تک بھی ممکن ہو، ناقابلِ اعتبار، ناقابلِ فہم اور ناقابلِ عمل بنا کر رکھ دینا چاہیے اور طرح طرح کے اختلافات قرآنی الفاظ اور معانی میں ڈال کر قرآن کو ان سے معطل چھوڑوا دینا چاہیے۔

یہ ایک ایسی کامیاب رائے اور اس کے مطابق کامیاب کوشش تھی کہ اگر واقعی اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمے قرآن پاک کی حفاظت نہ لے لی ہوتی، تو کبھی قرآن پاک محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ کاش اس وقت وہ منافقین اور ان کے وہ تلامذہ ہوتے، تو یقیناً ایمان لے آتے اور سچے دل سے مومن مسلم ہو جاتے کہ ان کی ساری مسلسل جد وجہد اور لگاتار ایسی خطرناک کوشش اور مسلمانوں کی پوری غفلت و سہل انگاری کے باوجود آج تک قرآن پاک اپنی اسی بے لوث تواتر تام کے ساتھ ہر مسلمان کے گھر میں اور کروڑوں حافظوں کے سینوں میں محفوظ موجود ہے اور اسی طرح موجود ہے جس طرح رسول اللہ صلعم نے اپنی وفات کے وقت اُمت کے لیے چھوڑا۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

غرض ان منافقین ایران نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے وضع احادیث کا مستقل کام شروع کر دیا اور روایتوں کا سلسلہ اتنے زبردست طریقے سے شروع کیا کہ عوام مسلمین کی ساری توجہ ان ہی روایات کی طرف منعطف ہو گئی اور عوام کا رجحان دیکھ دیکھ کر متاخرین خواص بھی آخر اُن کی طرف جھک پڑے۔ کچھ تو اس لیے کہ خربزے کو دیکھ کر خربزہ رنگ پکڑتا ہے۔ یہ منافقین ایران بھی تو عام طور سے اکابر اور تابعین ہی سمجھے جاتے تھے۔ ان کا اثر و رسوخ بھی تو عوام و خواص میں کچھ کم نہ تھا! اس لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک وہ جماعت جو بظاہر اکابر تابعین سمجھی جاتی ہے اور علم و فضل میں ایک خاص شہرت رکھتی ہے، وہ جس کام کو اتنے انہماک کے ساتھ دینی تبلیغ اور اسلامی اشاعت کے نام سے کرے اور پھر عوام کا ایک کافی طبقہ ان کی طرف متوجہ نہ ہو۔ یہ سارے مناظر دیکھ کر بھی کیا تھوڑے اصاغر تابعین بھی "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز" پر عمل نہ کرتے؟ اس لیے کچھ بھولے بھالے اکثر تابعین میں اُن منافقین کے دھوکے میں اگر آ گئے ہوں۔ تو

روایتیں باہم بھی مختلف ضرور تھیں، اس لیے لوگوں کو یہ پوچھنے کی ضرورت پڑی کہ تم نے کس سے سُنا اور اُنھوں نے کس سے سُنا؟

مگر فقہاء کا ذخیرہ تو نہایت محدود ذخیرہ تھا، جو بہت جلد ختم ہوگیا اور پھر ان کے خلاف راویانِ حدیث نے خوب خوب پروپاگنڈا کیا۔ جو مسئلہ فقہ انھوں نے لکھا، وہ تو بغیر عنعنہ کے لکھا اور رسول صلعم یا کسی صحابی کی طرف اُس کو منسوب نہیں کیا، اس لیے وہ سارے مسائل ان کے مخترعہ قرار دے کر ان پر ان کے اپنی طرف سے اختراع و احداث کا الزام دھر دیا گیا اور اپنی موضوع اور من گھڑت روایات کو خاص رسول اللہ صلعم کا قول و فعل بناکر عنعنہ کے ذریعہ مستند ثابت کرکے عوام پر یہ ثابت کیا کہ دیکھو، ہم تو حدیثِ رسول پیش کرتے ہیں اور یہ فقہا اپنی رائے اور اپنا قیاس و اجتہاد حدیث رسول سے بہتر سمجھتے ہیں۔ غرض ان وجوہ کی بنا پر تمام کمزور فقہا نے مجبورًا پھر وُہی راہ اختیار کرلی، جو راویانِ حدیث کی تھی اور اپنی فقہ کی عمارت پر بھی اُن ہی کی خود ساختہ روایات کا پشتہ لگادیا، یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ جیسے سچے اور خلفائے راشدین رضکے بالکل نقشِ قدم پر چلنے والے بزرگ کے بعض تلامذہ بھی ان کے بعد بہت حد تک راویانِ حدیث کے رنگ میں رنگ گئے اور متاخرین تو بہت کافی بہکے اور امام ابوحنیفہ کے صحیح اصول پر قائم نہ رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین کی کثیر جماعت امام ابوحنیفہ سے بے حد خفا رہی۔ یہاں تک کہ ان کو مرجیہ، گمراہ اور کیا کیا کچھ نہ کہا، صرف اس لیے کہ روایتوں کی یہ زیادہ پروا نہیں کرتے تھے۔

قرآن پاک پر روایات کے حملے

قرآن کے اثر کو روک دینے کے لیے
ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا! (اکبر الٰہ آبادی)

ان منافقینِ ایران نے قرآن پر روایات کے ذریعے مختلف طرح کے حملے کیے، جن کی مجملاً تشریح حسبِ ذیل ہے:

۱۔ جمع و تدوین۔ یعنی مشہور یہ کیا کہ یہ قرآن پاک جو موجودہ ترتیب اور موجودہ ہیئت میں

ہے۔ اس طرح رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں نہ تھا۔ بلکہ آں حضرت صلعم کی وفات کے بعد جنگ یمامہ میں ستر حفاظ قرآن کی شہادت دیکھ کر حضرت امیر المومنین فاروق اعظم رض کو بعہد خلافت صدیقی رض تقریباً ۱۱ھ میں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن پاک کو کتابی صورت میں مجتمع کر لیا جائے۔ کیونکہ اس وقت تک قرآن پاک صرف حفاظ کے سینوں ہی میں محفوظ تھا۔ ستر حافظ تو ایک جنگ ہی میں مارے گئے، اسی طرح اگر موجودہ حفاظ سب کے سب شہید ہو گئے، تو پھر کہاں قرآن اور کہاں یہ امت؟ غرض حضرت فاروق اعظم رض نے جمع قرآن کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے حضرت امیر المؤمنین صدیق اکبر رض کو اس طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے حضرت زید بن ثابت جو کاتب وحی بعہد نبوی آخر عہد میں تھے، ان کو آمادہ کیا اور پھر تمام صحابہ سے ہڈی، تختی، ٹھیکری، لکڑی، چھال، پتے اور کاغذ کے ٹکڑے جن پر انھوں نے رسول اللہ صلعم کے سامنے قرآن پاک کی آیتیں لکھ لکھ کر رکھی تھیں، حاصل کیے۔ سب کو ملا ملا کر، حافظوں سے تصدیق کرا کر قرآن پاک کو جمع کیا۔ اس وقت آخر سورۂ توبہ لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم ابو خزیمہ یا ابو خزیمہ انصاری کے پاس ملا۔ غرض یہ ایک نسخہ قرآن مرتب ہو کر حضرت صدیق اکبر رض کے پاس محفوظ رہا۔ ان کے بعد حضرت فاروق اعظم رض کے پاس رہا۔ ان کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ رض کے پاس چلا گیا اور وہیں ان کی زندگی تک رہا۔

پھر حضرت عثمان رض کے عہد میں لوگوں نے قرآن پاک میں اختلافات ڈالنا شروع کیے۔ حذیفہ ابن الیمان نے حضرت ذوالنورین رض کو پھر جمع قرآن کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے حضرت حفصہ رض کے ہاں سے مستعار وہ صحیفہ جمع کردہ حضرت صدیق اکبر رض منگوایا اور اس کی متعدد نقلیں کرائیں اور حضرت ام المؤمنین حفصہ رض کے پاس ان کا مصحف واپس کر دیا۔ اس نقل کے وقت بھی حضرت زید بن ثابت کو سورۂ احزاب کی ایک یا دو آیتیں یاد آئیں، جو مصحف میں نہ تھیں۔ بڑی تلاش کے بعد ابو خزیمہ بن ثابت الانصاری کے پاس وہ آیت یعنی من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ الخ ملی جس کے بارے میں زید نے کہا کہ ہم یہ آیت اس جگہ رسول صلعم سے سنتے تھے۔ یہ نہیں کہا کہ میں

پڑھتا تھا یا ہم لوگ پڑھتے تھے۔ غرض یہ کہ اب یہ آیت بھی اپنی جگہ پر لگا دی گئی۔

یہ دو روایتیں بے حد مشہور ہیں، اس لیے ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ غیر صحاح میں تو عجیب و غریب روایتیں بہت ساری ہیں، جن میں جمع و تدوین کے واقعات عجیب و غریب درج ہیں اور دیکھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں روایتیں صحاح میں حتیٰ کہ بخاری میں بھی ہیں۔

ان دونوں روایتوں سے آیتوں کی ترتیب، سورتوں کی ترتیب سب بعد کی ثابت ہوتی ہیں، ورنہ آیتوں کی تقدیم و تاخیر وغیرہ کا شبہ تو بہت آسانی سے پیدا کیا جا سکتا ہے اور پیدا کرنے والے پیدا کرتے ہیں، جن کی بنا صرف یہی روایتیں ہیں۔ میں نے جمع قرآن کے متعلق ساری روایتوں پر اور خصوصاً بخاری و ترمذی وغیرہ کی مذکورہ بالا دونوں روایتوں کی محدثانہ ہی اصول کے مطابق قابل دید تنقید کی ہے، جو ایک رسالہ ہی کی صورت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ اُسے چھپوا دوں۔

۲۔ اختلافِ قرأت۔ ایسی روایتیں سینکڑوں گھڑی گئیں کہ قرآن کی فلاں آیت میں فلاں لفظ اس طرح بھی ہے اور اُس طرح بھی۔ مثلاً مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، مَلَّاكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بھی ہے اور مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بھی اور پھر ان اختلافات کو درست ثابت کرنے کے لیے یہ حدیث بھی وضع کر لی گئی کہ اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ، یعنی، قرآن سات لغتوں میں اُتارا گیا اور اس حدیث کو عجیب و غریب مضحکہ انگیز عنوان سے بیان کیا گیا ہے میرا ایک مستقل رسالہ ان روایات موضوعہ کے متعلق ہے۔ افسوس کہ اپنی ناداری کی وجہ سے اب تک چھپوا نہ سکا۔

۳۔ ناسخ و منسوخ۔ ایک بہت بڑا فتنہ یہ پیدا کیا کہ قرآن پاک کی بعض آیتیں بعض دوسری آیتوں کی ناسخ ہیں، جن کا صحیح علم بغیر روایات کی مدد کے حاصل نہیں ہو سکتا، اس لیے قرآن تابع ہے اور روایات متبوع۔ قرآن محکوم ہے اور روایات حاکم۔ (معاذ اللہ من ذٰلک) كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ

اس موضوع پر بھی میرے متعدد مضامین رسالہ "اصولِ خمسہ" میں (جو ایک مناظرہ

کے سلسلہ میں اخبار "اتحاد" پٹنہ کے ساتھ بطور ضمیمہ کے شائع ہوا تھا) اور رسالہ "سادات" میں جو پھلواری ضلع پٹنہ سے ماہانہ شائع ہوتا تھا، چھپ چکے ہیں۔ مناظرہ بس اس پر ختم ہوگیا کہ آخر تنگ آکر میں نے مثبتین نسخ فی القرآن سے تین سوالات کیے، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآن پاک میں کتنی آیتیں قائلین نسخ کے نزدیک متفق علیہ منسوخ ہیں، ان کی صحیح تعداد بتائیے

۲۔ کم سے کم پانچ آیتیں متفق منسوخ بطور مثال کے پیش کیجیے جن کا نسخ آپ لوگوں کے نزدیک قطعی ہو۔

۳۔ منسوخ آیتوں پر عمل جائز ہوگا یا ناجائز؟

ان سوالات کے بعد ساری بحث ختم ہوگئی اور بڑے بڑے مناظرین دم بخود مبہوت رہ گئے اور پھر اس وقت تک کسی کا قلم نہ اٹھا۔

۴۔ شانِ نزول۔ قرآن پاک کی اکثر آیتوں سے متعلق شانِ نزول کے نام سے واہیتیں گھڑ گھڑ کر ان آیتوں کے صحیح مفہوم کو بدل دینے کی نامبارک کوششیں کی گئیں اور اس طرح تحریفِ معنوی کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا گیا۔ مثلاً سورۂ احزاب میں آیۂ تطہیر اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡهِبَ عَنۡكُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِیۡرًا کو جو صاف صاف ازواج مطہرات کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے، حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کی شان میں روایت کسا وضع کرکے بنا دیا اور اس پر اس قدر اصرار ہے، اس صریح جھوٹی روایت کو بعض سفہا نے متواتر تک لکھ مارا، حالاں کہ ان روایتوں کا ایک سلسلۂ روایت ایسا نہیں، جو شیعوں یا کذابوں کے وجود سے خالی ہو اور قرآن پاک کے سیاق وسباق کی مخالفت تو سب بالا ہے۔ اسی طرح اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُهٗ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَهُمۡ رٰكِعُوۡنَ ۝ کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رکوع کی حالت میں انگوٹھی ایک سائل کو دے دینے کی روایت وضع

کرکے اس آیت سے حضرت علی رضؓ کی ولایت عامہ وتامہ ثابت کرنے کی گمراہ کن کوشش کی گئی۔

اور پھر انبیاء علیہم السلام پر متعدد ناپاک حملے بھی ان ہی شانِ نزول والی روایتوں کے ذریعے کیے گئے۔ مثلاً حضرات ابوالبشر و اُم البشر آدم و حوا علیہما السلام کا نعوذ باللہ ارتکابِ شرک کر لینا اور توبہ کا بھی ذکر نہ کرنا، وغیرہا من الروایات الشنیعہ۔

۵۔ تفسیری روایتیں۔ بعض آیتوں سے متعلق بطور تفسیر کے خود رسول اللہ صلعم سے یا بعض صحابہ سے روایتیں منسوب کر ڈالیں کہ آپ نے یہ تفسیر اس آیت کی بیان فرمائی، حالانکہ وہ تفسیر سیاق و سباق قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ مثلاً بعشر سُوَرٍ امثالھا سے اس سے پہلے کی دس سورتیں مراد ہیں" لئلا یعلم اھل الکتب" سے مراد "لکی یعلم" ہے اور "لا" زائدہ ہے۔ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ o کِرَامٍ بَرَرَةٍ o میں سفرۃ سے مراد فرشتے ہیں: "لوح محفوظ" اور "کتاب مکنون" ایک تختہ ہے، جو عرش کے دائیں جانب رکھا ہوا ہے اور تمام ما کان و ما یکون سب اسی میں لکھا ہوا ہے۔ اسی کا نام لوح محفوظ ہے اور اسی کو کتاب مکنون بھی کہا گیا ہے۔ وکِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ o سے یعنی وہی تختۂ لوح محفوظ مراد ہے یا توریت مراد ہے۔ وغیرہا من الروایات الکثیرۃ الموضوعہ۔

۶۔ واقعات موضوعہ۔ بعض روایتیں ایسی وضع کر دی گئیں، جن کا کوئی ایسا واقعہ بیان کرکے کسی آیت کے ساتھ جوڑ ملا دیا گیا کہ وہ آیت اپنے صحیح مفہوم کی طرف سے ہٹ کر کسی نئی بات کی طرف اس واقعہ کے دیکھ لینے والے کے ذہن کو پھیر دے، جو اس روایت کے وضع کرنے والے کا مقصد ہے یا کم سے کم اس آیت کی اہمیت کم ہو جائے یا ناجائز طور سے بڑھ جائے یا منشا ہی میں تبدیلی واقع ہو جائے۔ مثلاً ہاروت و ماروت اور چاہِ بابل و زہرہ وغیرہ کے واقعات، پھر ایک ساحرہ عورت کا واقعہ، جو ایک دوسری جاہل عورت کو چاہِ بابل پر لے جاکر اُس کی تعلیم سحر کا باعث ہوئی تھی اور وہ عورت جو پھر توبہ کے لیے اپنی آخری عمر میں آمادہ ہوئی، تو اس کے لیے کوئی راہ نہ نکلی۔ مدینہ طیبہ پہنچی، تو آں حضرت صلعم وفات فرما چکے تھے۔ حضرت عائشہ رضؓ حضرت صدیق اکبر رضؓ اور تمام صحابہ رضؓ

نے بہت سوچا، مگر اُس کے دوبارہ مومنہ ہونے کی کوئی شکل نہ نکلی (دیکھیے مستدرک حاکم وغیرہ اور تفسیر عزیزی حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ)

۷۔ مکّیت و مدنیت۔ بعض سورتوں یا آیتوں کے مکّی یا مدنی ہونے کا قطعیت کے ساتھ ایسا غلط فیصلہ کیا، جس سے تاریخی طور سے مطلب سمجھنے میں دھوکا ہو جائے۔ مثلاً سورۂ کوثر کو مَکِّیَّۃٌ لکھ دیا۔ اسی طرح بعض مکّی سورتوں کی چند یا ایک آیت کو مدنی لکھ دیا، لیکن جو محض ایک ظنّی اور قیاسی بیان ہے، مگر اس بنا پر قطعی احکام صادر کرنے لگے اور لگے قطعی آیات کو ظنّی قیاس کا پابند کرنے۔

۸۔ تقدیم و تاخیر نزولی۔ اسی طرح یہ روایتیں کہ فلاں سورہ پہلے اترا اور فلاں بعد کو، اور پھر اسی بنا پر آیتوں کے صریح معانی میں تبدیلی و تغیر پیدا کرنے لگے، حالانکہ صریح معانی جو عبارت النص سے نکل رہے ہیں، قطعی ہیں اور یہ تقدیم و تاخیر کی روایتیں ظنی۔ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔

غرض اس قسم کے بہت سے اور بھی عنوانات قائم ہو سکتے ہیں۔ میں نے محض قلم برداشتہ سرسری طور سے یہ آٹھ عنوان بطور نمونہ کے پیش کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان روایاتِ موضوعہ کے ذریعے قرآن پاک پر طرح طرح کے حملے کیے گئے اور ہر ممکن کوشش پورے اہتمام کے ساتھ کی گئی کہ کسی طرح یہ کتاب مسلمانوں سے چھوٹ جائے اور معطّل رہ جائے اور از کار رفتہ ہو جائے۔ چنانچہ واقعی قرآن پاک عام طور سے مسلمانوں سے چھوٹ گیا اور معطل ہو گیا۔ علمائے مقلّدین کو ہدایہ شرح وقایہ کافی ٹھیری۔ غیر مقلّدین کو صحاح ستہ سے فرصت نہیں۔ صوفیوں کو مکتوبات و ملفوظات سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ قرآن پاک صرف بے معنی و مطلب سمجھے صرف رمضان میں یا روزانہ ہی سہی کچھ ورق گردانی کر لینے کے لیے ہے۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ دو تین فی صدی کے لیے۔ روزانہ عام لوگوں کے لیے تو صرف درود و وظائف کے لیے، عمل و عملیات کے لیے، جھاڑ پھونک کے لیے یا ایصالِ ثواب کے لیے اور بس۔ ہدایت کا مصرف تو قرآن پاک سے منتقل ہو کر انسانی تقاضا

کی طرف چلا گیا۔

وفائے وعدۂ حفاظتِ قرآن

مگر حقیقت یہ ہے کہ اتنے شدید اور ایسے دیرپا حملوں اور ہر طرف سے حملوں کے باوجود قرآن پاک کا اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ ہر تغیر و تبدل سے قطعی طور سے محفوظ رہنا اور معجزنما تواتر کے ساتھ ساری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ بلا اختلاف ایک حیثیت سے ایک قرأت سے، ایک رسم خط سے موجود رہنا اور پھر اس کے لفظی ترجموں کا تقریباً ہر ملک اور ہر بڑی قوم کی زبان میں موجود رہنا اور اس طرح خود قرآن پاک کا اور قرآن پاک کی ہدایتوں کا دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچ جانا اور ان لوگوں کو جو اس سے دور پڑے ہوئے ہیں، پکار پکار کر اپنے قریب بلانا، یہ وہ باتیں ہیں جو نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کے وعدۂ صادقہ کو بآواز بلند سارے عالم کو یاد دلا رہی ہیں اور لَا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ ۔ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ ٥ کی شانِ بلند کا چار دانگِ عالم میں اعلان کر رہی ہیں۔ پھر کون ہے جس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی ہو اور ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ۔ سن کر سر تسلیم خم نہ کر دے۔ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللہُ مِنْ کِتَابٍ۔

عام راویانِ حدیث

اسماء الرجال کی کتابوں کا مطالعہ بہ غور کیجیے، تو آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ خدا جھوٹ نہ بلائے تو کم سے کم پچاس فی صدی راوی تو آپ کو عجمی ہی ملیں گے اور باقی پچاس فی صدی میں سے بھی اسی فی صدی غیر حجازی، یعنی، کوفی، بصری، شامی، عراقی وغیرہ جن میں روافض، خوارج، قدریے، جبریے، جہمیے، معتزلے، غرض ہر فرقے کے لوگ کثرت سے بفضلہ تعالےٰ موجود نظر آئیں گے، جن میں اکثر اُن ہی منافقین ایران کے ذریات یا تلامذہ یا فیض یافتگانِ صحبت ہی ملیں گے۔

مخلص راویانِ حدیث

اسی جماعت میں بعض مخلص اور سچے راویانِ حدیث بھی ہیں، جن کو ان کاذبوں اور وضاعوں کے جھٹلانے کے لیے یا تعامل عہدِ نبوی و عہدِ خلفائے راشدین رض کا صحیح حال بتانے کے لیے صحیح روایت کرنے کی ضرورت پڑی، کیوں کہ اگر دنیا میں جھوٹی ہی روایتوں کا رواج چھوڑ دیا جاتا اور ان کذابوں اور وضاعوں کے ہاتھ میں عامۃ المسلمین کو رہنے دیا جاتا، تو پھر آئندہ چل کر امتِ مسلمہ حق و باطل کا کوئی فیصلہ نہ کر سکتی، اس لیے یہ مخلصین خاموش نہ بیٹھ سکے اور جتنا بھر جانتے تھے، صحیح روایتیں بیان کرنے لگے اور جھوٹوں کو جھٹلانے لگے۔ پھر اسماء الرجال کا ذخیرہ جمع کرنے لگے، جس میں ان کذابوں اور وضاعوں کا پوشیدہ حال تحقیق کر کے لکھنے لگے تاکہ ان کی روایتوں سے آگے چل کر مسلمان دھوکا نہ کھائیں اور حق و باطل کی تمیز کر سکیں۔ تنقید روایات کے اصول بنائے اور جہاں تک ہو سکا خود بھی ان اصول پر عمل کیا اور تلامذہ کو بھی ان اصول پر عمل کرنے کی تاکید کی فجزاھم اللہ خیر الجزاء

جامعینِ احادیث

اس وقت جو حدیث کی کتابیں علمائے اسلام کے ہاتھوں میں ہیں، ان میں سب سے قدیم کتاب موطائے امام مالک رح ہے۔ امام مالک بن انس رح کی ولادت تقریباً بالاتفاق ۹۳ھ کی ہے۔ عمر بعض نے پچاسی برس اور بعض نے نوے برس اور بعض نے اٹھتر برس لکھی ہے، اس لیے سالِ وفات حسبِ اختلاف اقوالِ مدتِ عمر ۱۷۸ھ یا ۱۸۳ھ یا ۱۷۱ھ ہوتا ہے، مگر بعض نے ۱۷۹ھ اور بعض نے ۱۹۹ھ کو سالِ وفات لکھا ہے۔ عمر کے متعلق بھی اور سالِ وفات کے متعلق بھی پہلا ہی قول صحیح تر معلوم ہوتا ہے۔ ۱۷۸ھ اور ۱۷۹ھ کا فرق جو حساب سے ہو رہا ہے، وہ دو تین مہینوں کی وجہ سے، بلکہ دو ایک ہفتے، بلکہ دو ایک دن کی وجہ سے بھی ممکن ہے۔ اس لیے یہ یقینی ہے کہ ان کی تصنیف موطا دوسری صدی ہجری کی تصنیف ہے۔ ان کے عہد تک اگرچہ تنقیدِ حدیث کے اصول و ضوابط منضبط نہیں ہوئے

تھے، مگر ان کی کتاب یہ بتارہی ہے کہ امام مالک نے طوفان روایات کو اُمنڈتا ہُوا دیکھ کر اس کی ضرورت محسوس کی کہ کسی طرح کچھ روایات کو جانچ پرتال کرکے جمع کرلیا جائے اور قوم کے آگے اس مجموعے کو پیش کردیا کہ اگر تم احادیثِ رسول صلعم پر اس قدر مرتے ہو، تو صحیح روایتیں بس اسی قدر ملی ہیں۔ یہ بھی وُہ روایتیں ہیں جن پر صحیح ہونے کا گمان کیا جاسکتا ہے، یعنی، بادی النظر میں جو روایتیں صحیح نظر آئیں اُنھیں کو جمع کرلیا گیا ہے، ورنہ خود امام مالک غالباً موطا کی سب روایتوں کی صحت پر کبھی حلف شرعی نہیں اُٹھا سکتے تھے۔

اسی طرح ان کے بعد جب امام بخاری نے دیکھا کہ موطا پر مسلمان اکتفا نہیں کرتے اور سلسلۂ روایات جاری ہے، تو انھوں نے تنقیدِ حدیث کے اصول بنائے۔ اُن اصول کا اعلان کیا اور بڑی کاوش کے بعد کئی لاکھ حدیثوں میں سے مکرّرات کو حساب نہ کیجیے، تو صرف دُو ہزار حدیثیں بمشکل ایسی جمع کرسکے جن کو وہ صحیح کہ سکتے تھے۔

اور آخر عہد میں امام مسلم نے بھی توجہ کی اور پھر تو یہ بھی شوق پورا کرنے کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا اور بہتیروں کو جمع حدیث کا سودا ہوا اور کتنوں نے اپنے دل ذ حسرت نکال لی۔ یہاں تک کہ ہمارے صوبہ بہار کے ایک عالم ہمارے دوست مولانا ظفرالدین صاحب مدرّس علم ہیئت و ہندسہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے بھی اس دَورِ فتن میں الصحیح البہاری کی متعدّد جلدیں لکھ کر رکھ دیں، جن میں سے دو جلدیں سر فخرالدین مرحوم سابق وزیر تعلیم صوبہ بہار واڑلیسہ کی علماء نوازی کی بدولت چھپ کر شائع بھی ہوگئیں۔

غرض جس روایت کو اگلے جامع روایات نے ناقابلِ قبول سمجھ کر چھانٹ دیا اور ردّ کر دیا۔ اُسی کو بعد والے نے قبول کرکے اپنے ذخیرے میں درج کرلیا۔ اس طرح آخر کتنی مرُدود روایتیں مقبول ہو ہو کر پھر درج کتب حدیث ہوگئیں اور وہ طوفان جس کے ڈر سے اگلے جامعین نے جمع حدیث کا کام شروع کیا تھا، متاخرین کے شوقِ تصنیف و تالیف کی بدولت زبانوں سے کتابوں کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے برپا رہ گیا۔ فرق اس قدر ہے کہ پہلے زبانی تھیں، اس لیے بے پایاں تھیں اور ایک حد تک تغیر و ردّ و بدل کی محتمل اور اب قلم بند ہونے کی وجہ سے محدود ہوگئیں اور اب ان میں ردّ و بدل مشکل ہے۔

ہم اب کیا کریں؟

ان حالات کے ماتحت بہت اہم سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ہم اب کیا کریں؟ افسوس کہ قلت وقت اور طوالت تحریر کے ڈر سے میں نے اس سوال کو بہت قبل از وقت چھیڑ دیا، کیوں کہ روایات کے دونوں رُخ کے متعلق بہت سی ضروری باتیں رہ گئیں۔ کاش مجھے اتنا موقع ملتا کہ میں تمام باتیں دونوں رُخوں سے متعلق عرض کر لیتا۔ جب یہ سوال پیش کرکے جواب لکھتا، مگر تحریر بہت طویل ہو چکی، اور اب میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں کہ زیادہ لکھ سکوں، اس لیے مجبوراً یہ سوال پیش کرکے جواب لکھ رہا ہوں۔

بخاری کی ایک حدیث ہے، جو اگرچہ بخاری کے موجودہ نسخوں میں نہیں ملتی، مگر امام بخاری نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں روایت ضرور کیا ہے، جس کے شاہدین عادلین حضرت صدر الشریعۃ، علامہ تفتازانی، علامہ سید السند اور حضرت شیخ الاسلام وغیرہم جیسے اکابر علماء ہیں۔ اس لیے چاہے موجودہ نسخہ بخاری میں یہ حدیث نہ ہو، مگر امام بخاری نے اس کو اپنی صحیح میں ضرور درج کیا ہے۔ وہ یہ ہے: تَكْثُرُ لَكُمُ الْاَحَادِيْثُ بَعْدِىْ فَمَا رُوِىَ لَكُمْ حَدِيْثٌ عَنِّىْ فَاعْرِضُوْهُ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ فَمَا وَافَقَهٗ فَاقْبَلُوْهُ وَمَا خَالَفَهٗ فَرُدُّوْهُ، یعنی، میرے بعد حدیثوں کی بڑی کثرت ہو گی، تو جو حدیث ہم سے روایت کی جائے، اس کو کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو۔ جو کتاب اللہ کے موافق ہو، اس کو قبول کرو اور جو مخالف ہو، اس کو رد کر دو۔ یہ حدیث محض خفیف سے فرق کے ساتھ شیعوں کی سب سے پہلی کتاب حدیث اور سب سے زیادہ معتبر جو آن کے امام زمان کی مصدقہ ہے "اصول کافی" اس میں بھی موجود ہے۔ اس لیے دونوں فرقوں کی متفق علیہ ہے اور عقلاً و درایۃً بھی ہر طرح صحیح ہے۔

اس لیے ہم اسی اصول پر ہر روایت کو جانچیں گے۔ ایک دیوانی عورت پھلواری میں ایک دیہات سے اکثر آتی ہے، جو عموماً گھروں میں وعظ و نصیحت کیا کرتی ہے۔ جاہل ہے، مگر باتیں اکثر کام کی کرتی ہے۔ ایک شاہ صاحب نے اس سے پوچھا کہ تم وعظ تو بہت کہتی ہو۔ مگر اللہ و رسولؐ کو کیسے پہچانتی ہو؟ تو اس نے برجستہ کہا کہ "اللہ کا بھیجا رسول اور رسول کا بتایا اللہ"۔ میں اس کے اس جواب سے پھڑک گیا۔ غرض یہ ہے کہ میں قرآن پاک کی عبارت النص اور سیاق و سباق سے روایات کی صحت و عدم صحت کا پتہ لگا لوں گا اور لگا لیتا ہوں اور قرآن پاک کے اشارۃ النص و اقتضاء النص و دلالۃ النص کو روایات صحیحہ کی تصریحات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ جب میں مفسرین کی تشریحوں سے قرآن کے مفاہیم کو سمجھنے میں مدد لیتا ہوں، چاہے وہ مفسرین

اگلے ہوں یا پچھلے۔ مولانا اشرف علی تھانوی ہوں یا مولانا عبدالحق حقانی۔ خواجہ احمدالدین امرتسری ہوں یا مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ فراہی ہوں یا مولانا محمود الحسن، غرض جب عام انسانی فہم وعقل کو ہم معانیٔ قرآن کے سمجھنے میں اپنا معین ومشیر بناتے ہیں، تو پھر ایسی روایات جن کی صحت کا کم سے کم امکان یا ظن غالب ہو کیوں نہ اُن سے بھی مدد لی جائے اور جو معنی ان روایات قریب بہ صحت کے مطابق ہوں، ان کو ہماری جاہلانہ تفسیر بالرائے پر کیوں نہ ترجیح دی جائے؟ کیوں کہ آج کل مفسرین جس قدر محاورات ولغات عرب سے باخبر ہیں اور عربی زبان دانی سے جتنا ان کو تعلق ہے، وہ دنیا پہ خوب روشن ہے۔

دوسرے یہ کہ آج کل عموماً تفسیر کرنے سے پیشتر کچھ خیالات، سیاسی ہوں یا معاشرتی یا اقتصادی، ضرور ذہن میں موجود رہتے ہیں۔ بس اُن ہی خیالات کے زیر اثر قرآن کے معانی لگائے جاتے ہیں۔ ہم ایسے مفسرین کو ان منافقین ایران سے کم گمراہ کن نہیں سمجھتے، کیوں کہ یہ خود قرآن پاک کے تابع نہیں ہوتے، بلکہ قرآن کو اپنا تابع اور پھر قرآن کی وساطت سے سارے مسلمانوں کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہیں۔ اللھم احفظنا من شرور انفسنا۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔